

انگریزی میں کاکالیا چھپا تھا۔ بڑھی نے کھوکھ کی لکڑی بغیر رنہ کیے یہاں لگادی تھی اور سبز رونگن کے باوجود یہ لفظ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ثریانے سوچا کہ کسی شہر کا نام ہو، کچھ بھی ہواں نے جی ہی میں کہا۔ عجیب سانام ہے جیسے کسی نے گود میں بچہ اٹھایا ہو۔ کاکالیا اور پھر وہ خود ہی اپنی اس فضول کی بات پر مسکرا پڑی۔ میں کی لہریا چھت پر نظریں گاڑے اس نے ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی مگر میٹھے آموں کا سوم رس ریشه ریشہ میں عجیب امرت گھول رہا تھا۔ نیند غائب تھی مگر آنکھیں پھی جا رہی تھیں۔

یوں توہر امتحان دے چکنے کے بعد آدمی کے سر سے ایک ایسا بوجھ سا اُتر جاتا ہے کہ سوائے کھانے اور سونے کے کوئی مقصد ہی نہیں رہتا مگر میڑک کا آخری پرچ ختم کر چکنے کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ آج سے مستقبل محفوظ ہو اور زندگی کے آخری سانس تک کی پیشان پکی ہو گئی۔ وہ صاجزادے جو دس پندرہ دن پہلے میلے کھلے دستر خوان میں نکلے گئے کی برف لینے بھیجے جاتے تھے، ایک دم معزز سے ہو کر منہ پر انگریزی اخبار ڈالے پنکھوں تلے دوپھریں گزارتے ہیں۔ کہنا سننا تو ایک طرف سب گھر والوں کی ذمیں ہو تیں تو ان کے گرد حلقة باندھ کر یوں ہلاتے گویا کہہ رہے ہوں کاش ہمارے عاجزی و انساری اور محبت و شفقت کے اظہار کا کوئی اور لطیف ذریعہ بھی ہوتا۔ لڑکیوں کا درجہ اور بھی اوپنجا سے کیونکہ دسویں کے بعد لڑکی کی ایک واضح صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ایک تمحیج الدماغ اور نارمل انسان میڑک لڑکی کو ان پڑھ گر بھجوایث صاجزادی پر ترجیح دیتا ہے۔ دسویں پاس لڑکی میں کچھ ان امر و دوں کی سی گدری گدری خوبصورتی ہے جنہیں باغبان ڈالی سے توڑ کر پتوں کے بستر پر رکھے جاتا ہو۔ یوں تو سگندھ ہرامرو دیں ہوتی ہے مگر جب چھپیے والا قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتا ہے کہ جناب یہ توڑ کرے کی دا ب ہے توہی سبی گدر اہم بھی معدوم ہو جاتی ہے۔ واضح شکل سے یہاں مراد کوئی شخصیت، فردیت وغیرہ نہیں۔ بس واضح سی شکل ہی ہے جس کا قلیدس یا مسلحانہ سے کوئی تعلق نہیں۔ زیریں منزل پر پانی کا نائل ہوتا ہے ناپس کچھ ایسے ہی سمجھتے۔ دھار انکتے ہی بالائی کے تنے ہوئے جستی پیندے پر ایسا نقارہ بجاتا ہے۔ گویا فطاری کی صلا ہو۔ دیے تو پانی بالائی منزل پر بھی پہنچتا ہے مگر باریک سی ٹنکتی کے

آگے آتیں چڑھا کر بیٹھے رہنے سے تیم بہتر! ثریا کو دسویں کا امتحان دیئے کوئی ایک مہینہ گزر چکا تھا اور اب وہ نتیجہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اس اثناء میں اسے فرمائشی پروگرام سننے، جی بھر کے سونے اور فلمی رسالے پڑھنے کے علاوہ صبح و شام باقاعدگی سے دودھ بھی پینا ہوتا تھا کیونکہ اس کی امی کے نزدیک رنگت نکھارنے کا یہی ایک طریقہ تھا۔ امینہ کا گھر گواں کے یہاں سے پانچ سات میل دور تھا، اس پر بھی ثریا کو ہر روز اپنی سہیلی سے ملنے کی کھلی اجازت مل چکی تھی۔ یہ بات الگ تھی کہ وہ اپنی سُستی کی بدولت امینہ سے ہفتہ میں ایک بار بھی مل نہ پاتی۔ پہلے دن کمرہ امتحان کو جاتے ہوئے اس نے امی سے جوان کی گھری لی تھی تو آج تک لوٹانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی تھی۔ سہیلیوں کو خط لکھنے اور معنے بھرنے کو اباجی نے اپنا پار کر جو نیز خود اسے بخش دیا تھا۔ پہلے کاپی بھی امی سے پوچھ کر منگوائی جاتی۔ اب مہینے میں نچپ چاپ ہاکر سے دو تین فلمی پرچے بھی لے لیتی تو اباجی اخبار کے ساتھ آپ سے آپ بل ادا کر دیتے۔ بھائی جان پہلے ہی اس پر مہربان تھے اور مانی سے جھگڑا کرنے کو اب خود اس کا بھی نہ مانتا تھا۔

جو دوپہر اس نے فیل پاپر سرسوں کی کھلی گونی کی طرح سو سو کے گزار دی تھی، اسی دوپہر چلپلاتی دھوپ میں لطیف صاحب کے کوارٹر پر ایک تانگے آکے رکا تھا اور ایک بڑا سا کالاڑیک اور مچھلی پکڑنے کی لمبی سی ولاٽی بنسی چھوڑ کے چلا گیا تھا۔ اگر وہ کوئی کہانی پڑھ رہی ہوتی یا معمہ حل کرنے میں مصروف ہوتی یا کم از کم شدید گرمی نے اس پر صرف غنوڈگی ہی طاری کی ہوتی تو وہ فیل پا سے اٹھ کر جعفری کے کمرے میں سے ضرور اس تانگے کو دیکھتی کیونکہ پڑوسیوں کے مہماں اپنے مہمانوں سے کہیں دلچسپ ہوتے ہیں مگر ثریا اٹھنے سکی۔ کنہجھ کرن کاروپ دھار کر سونے والی کو پتہ بھی نہ چلا کہ کون آیا اور کون گیا۔ شام کو جب کھانے کی میز پر اباجی نے بتایا کہ لطیف صاحب کا بھانجا امتحان دے کر چند مہینوں کے لیے ماںوں کے پاس آیا ہے تو ثریا کو یاد آیا کہ واقعی امتحان دینے کے فوراً بعد لوگ اپنے رشتہ داروں کے یہاں جا کر کئی کئی مہینے گزارا کرتے تھے اور خوب مزے سے وقت بتایا کرتے ہیں۔ اس رات وہ بڑی دیر تک کروٹیں بدلتی رہی۔ یہ نیند خدا نخواستہ مہماں کی آمد پر اچاٹ نہ ہوئی تھی بلکہ کچھ جس کی وجہ سے اور کچھ دوپہر کو زیادہ سولینے کے سبب حرام سی ہو رہی تھی۔ اپنے مہماں نواز

رشتہ داروں اور فیاض عزیزوں کا تصور باندھے ہوئے کوئی سائز ہے بارہ بجے کے قریب  
شیا پھر میٹھی نیند سوگئی۔

بڑے کمرے میں چھت کا پنکھا پوری رفتار پر چھوڑ کر امینہ نے شیا کو گردن سے  
پکڑ لیا اور جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ ”چیخ جیتا کیمنی ورنہ میں تجھے جان سے مار دوں گی۔“  
شیا اس کی دونوں کلاں یاں پکڑ کر کچھ شرات کچھ خجالت سے ہٹنے لگی اور اسے  
پرے دھکلتے ہوئے بولی۔ ”چھوڑ تو سہی یہ تیرے بلی کے پنج میراخون کے دینے  
ہیں۔“ اس خفیف سی ہاتھا پائی میں دونوں مسکراتی ہوئیں بڑے صوفے میں گر گئیں۔  
قریب ہی چھوٹی تپائی سے لیٹر اور پر شیا کا زانو لگنے سے قالین پر گر گیا۔ اسے انجات  
ہوئے شیا نے پوچھا۔ ”اچھا تو نے وہ ہوم ناسک ختم کر لیا؟“ تو امینہ نے شکوہ آمیز لہجہ  
میں جواب دیا۔ ”میں کیا کروں۔ ڈیڈی اپنی الماری کو تالا لگا کے رکھتے ہیں اور پھر گرمی  
اتنی ہوتی ہے کہ کسی کام کو جی نہیں چاہتا۔“

شیانے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ ”چلو جی ہمیں کیا تمہیں ہی گناہ ہو گا۔“  
اور پھر لیٹر اور پر تپائی پر پڑی ہوئی ایک موٹی سی کتاب میں دبادیا۔  
امینہ نے زمین پر جھک کر اپنی چپلی کے بکل کھولتے ہوئے پوچھا۔ ”چیخ جیتا  
شیا تیرے دل میں کیا ہے۔ تجھے میری قسم جو جھوٹ بولے۔ آخر اتنے دن آئی کیوں  
نہیں؟“

”بس یو نہی۔“ شیا نے گریبان میں پھوٹک مار کر جواب دیا۔

”اتنے دن گھر پر ہی رہی؟“

”اوہ کہاں جاتی؟“

”پھر یہاں کیوں نہ آئی؟“

”بس آہی نہ سکی۔ پھر تو ہمارے یہاں کون سے روز کے پھرے ڈالتی  
ہے۔“

”دیکھانا وہی بات۔“ امینہ نے آنکھیں گھما کر کہا۔ ”پہلے تین چار دن تو آہی  
نہ سکتی تھی۔ اس کے بعد ڈیڈی کے چیف کنزور آگئے اور مجھے پانچ منٹ کے لیے بھی  
کارنہ مل سکی۔ اسی لیے تو میں نے مالی کو رقہ دے کر بھیجا تھا۔“

”توبس پہ آجائی، وہاں کس نے تیری راہ—“

”مجھے تو ان سمجھت بسوں کے نمبروں کا ہی پتہ نہیں چلتا۔“ اینہے نے بات کاٹی۔ ”تیرے گھر آنے کو تین چار مرتبہ بد لئی پڑتی ہیں۔ کسی سے پوچھو تو کوئی کچھ بتاتا ہے کوئی کچھ۔ میں کیسے آتی شریا؟“

شریا سے بڑا ہی سخت جواب دینے لگی تھی کہ اینہے کے ڈیڈی اندر آگئے۔ عکھے کے ریگولیٹر سے نگاہیں اٹھاتے ہی انہوں نے شریا کو دیکھا تو دور سے پکارے۔ ”کہو بھی شریا، کچھ تمہارے رزلٹ کا پتہ چلا؟“

”جی ابھی تو نہیں۔“ شریا نے سست کر جواب دیا۔

”پھر بھی کتنے نمبر آ جائیں گے؟“

”جی یہی سینئڈ ڈویشن بن جائے گی بس۔“

”اور کیا چاہیے۔“ انہوں نے ہنسنے کی کوشش کی اور مسکرا کے رہ گئے۔

اینه نے اپنی چوٹی کھولتے ہوئے چلپاں پاؤں سے پرے دھکلیں دیں اور عکھے کے نیچے سرو قد ایستادہ اپنے ڈیڈی سے پوچھا۔ ”ڈیڈی آپ کے کنزٹرولر کب جائیں گے؟“

”کل شام بیٹا!“

”پھر پرسوں ہم پک بک پہ چلیں گے۔“ اینہے نے الٹی میشم دیا۔

”اس گرمی میں؟“ ڈیڈی نے گریبان کے بٹن کھولتے ہوئے کہا۔ ”کوئی چھیننا پڑے تو مرا آئے۔ ایسی گرمی میں تو اپنا ہی بھرتہ ہو جائے گا۔“

”نہیں ڈیڈی ہم ضرور جائیں گے۔“ اینہے ضد کرنے لگی۔

”اے سمجھاؤ شریا۔ بھلا یہ موسم کوئی پک بک پہ جانے کا ہے۔“ ڈیڈی آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا تو بہ تو بہ پکارنے لگے۔ شریا مسکرانے لگی تو اینہ روکھی ہو کر بولی۔

”بارش تو سار اسال نہیں ہو گی، ہم کیا پک بک پہ نہیں جائیں گے؟“

گریبان کے بٹن بند کرتے ہوئے ڈیڈی نے اطمینان سے کہا۔ ”دعا کرو دعا۔“ دعا میں بڑی برکت ہے۔

”پھر کرسی سے اپنا اور کوٹ اٹھایا اور باہر نکل گئے۔“

”ڈیڈی کے پچھے۔“ اینہ نے جھوٹ موت غصے سے شلوار کے پانچھے اور پ

کھینچتے ہوئے کہا۔ ”گرمی کی بجی۔“

کھانا کھا جنے کے بعد جب دونوں سہیلیاں اینہ کے سونے والے کمرے میں نیبل فین کے سامنے آپسیں تو شریانے کہا۔ ”لطیف صاحب تو ایسے گورے نہیں پروہ اتنا سفید ہے جیسے روئی کا گالا۔ لڑکے اتنے گورے اچھے نہیں لگتے۔ نہیں لگتے نا؟“ اس نے اینہ سے تصدیق کرانی چاہی۔

اینه نے منہ سکوڑ کر کہا۔ ”لگتے بھی ہیں اور نہیں بھی۔ ہاں ذرا کم ہی اچھے لگتے ہیں پھر؟“

”پھر کیا؟“ شریانے کہا۔ ”سارا دن برآمدے میں پنچھالگا کے کچھ لکھتا رہتا ہے۔ کبھی سکریٹ پینے لگتا ہے۔ کبھی تانگیں اٹھا کے میز پر ڈال لیتا ہے۔“

”کسی کو تو لیٹر لکھتا ہو گا۔“ اینہ نے سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ایسا نہیں۔“ شریا جلدی سے بولی۔ پھر خفیف ہو کر کہنے لگی۔ ”ٹھیک ہے، یو ہنی ہو گا۔ ایسا ہی ہے اینہ۔ تو لیٹر ہی لکھتا ہے۔“

”کالے منہ والا۔“ اینہ نے چڑ کر کہا۔ ”بارہ روز سے میری سہیلی چھین رکھی ہے۔“ اور اس نے سہیلی کے گلے میں با نہیں ڈال دیں۔

”بڑا آیا چھیننے والا۔“ شریانے بانہوں کے حلقو سے نکلتے ہوئے کہا۔ ”اسے تو پتہ بھی نہیں کہ سولہ نمبر میں میں رہتی ہوں۔“

”سب پتہ ہے شریا۔“ اینہ نے دلوں سے کہا۔ ”یہ لڑکے بڑے ہشیار ہوتے ہیں۔“

”پروہ تو اُوسا ہے۔ اُو کی دم فاختہ۔“ شریا کا خیال تھا کہ اینہ بھی اس کی بھی میں شریک ہو جائے گی مگر وہ خاموشی کے ساتھ اپنی چوٹی سے کھلیتی رہی۔

”یہ بیٹھا بر سر بڑا خطرناک ہوتا ہے گویا۔“ اینہ نے بڑی بوڑھیوں کا سا انداز اختیار کر کے کہا۔ ”ایک تیری سانوںی سلونی کش دوسرے اس سفید چوہے کی بے نیازیوں کے پھندے دونوں ایسی پکھلی میں پھنسو گے کہ مجھ ایسی سہیلیاں بارہ برس شکل دیکھنے کو ترس جائیں گی۔“

”دورد فان۔“ شریانے بڑی ہمت سے کہا۔ ”ایسی کوئی قیامت آئی جاتی ہے۔“

”اچھا بی۔“ امینہ نے ہاتھ پھیر کر کہا۔ ”ٹھیک ہو گا۔“

اب کے گرمی نے کوئی آفت ڈھائی تھی کہ لوگوں نے آسمان کی طرف دیکھنا بھی ترک کر دیا تھا۔ دن بھر کڑا کے کی دھوپ پڑتی۔ سہ پہر کو لوٹنے لگتی اور شام سے جس کی باتاں تین تن جاتیں۔ یوں لگتا تھا گویا سالہا سال سے اس زمین نے بارش کی بوند تک نہ دیکھی ہو۔ دفتروں کے اوقات میں آئے دن تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ کار و بار ماں د پڑتا جا رہا تھا۔ جنس کے بھاؤ چڑھ رہے تھے اور لوگوں کے منہ اترتے جا رہے تھے۔ سورج کے آتشیں تیروں نے ضروری سے ضروری کام کو گھائل کر دیا تھا اور خس خانوں میں بیٹھنے والے آج کے کام کو آنے والے اچھے دنوں پر چھوڑ دیتے تھے۔ شریا کے اب اجی جب دفتر سے لوٹتے تو بآمدے کی سیر ہیوں پر قدم رکھتے ہی ہر روز یہی کہتے۔ ”اب کی بار جو گرمی پڑ رہی ہے، اس سے پہلے اپنی ساری عمر میں نہ دیکھی، نہ سنی۔ غصب خدا کا 117-118 ڈگری بھلا اس ملک میں کون جئے گا۔“ پھر وہ ہیئت کھوٹی پر لٹکاتے ہوئے کہتے۔ ”کہیں بارش کے آثار بھی تو دکھائی نہیں دیتے جو آدمی زندہ رہنے کی امید باندھ لے۔“

اتی کہتیں۔ ”اور عنکھے کے نیچے بیٹھ کر اور جسم جلتا ہے۔ کہیں سے دو بوندیں پڑیں تو کپڑے ہی سی لوں۔ دو مہینوں سے قطع کیا ہوا گھٹ پڑا ہے۔“

مانی سکول سے آتے ہی دیوار کے ساتھ کمر کھجانے لگتا تو بھائی جان اپنے ننگے پیٹ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتے ہوئے کہتے۔ ”بیٹا یہ گرمی کے دانے ہیں، دیواروں سے رگڑے لگا کر نہیں ملتے۔ باد لوں کی پھوار مانگتے ہیں۔ جس دن اپنے کوارٹر سے دس میل پرے بارش ہو گئی تیرا پنڈا مخمل سانکل آئے گا۔“ لیکن مانی یہاں تک کھجا تاکہ خون نکل آتا۔ گرمی شریا کو بھی لگتی تھی اور دو ہرے کپڑے پہننے سے جان اور بھی عذاب میں تھی، مگر اس کی دو پہر نیند کے غلبے میں کافی آسانی سے گزر جاتی۔

جب لطیف صاحب کے بھانجے کو گرمی بہت زیادہ ستانے لگتی تو وہ اپنے سفید پائچا سے کے پائیچے گھٹنوں تک چڑھاتا۔ تھوڑی دیر بعد قیص بھی اتار دیتا اور پھر ڈور

بندھی پنگ پانگ کی گیند میز سے اٹھا کر فرش پر جاتا۔ برآمدے کے کونے سے چتکبرا  
بلو نگڑا بجلی کی طرح تڑپ کر گیند سے لپٹ جاتا اور سیمنٹ کے فرش پر کمر کے بل پھر کی  
سی گھونٹے لگتا۔ اسی پھر تی میں جب بلو نگڑا اڑواری کے بھلاوے اپنی ذم پکڑ لیتا تو لڑکے  
کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اس کے چہرے پر شنگر فی سی ہو کر پھیل جاتی اور جعفری کے  
پیچھے ثریا ہو لے ہو لے ہنٹے لگتی۔

کل شام جب یہی لڑکا ململ کا کلیوں والا گرتہ، کھلے پائیچوں کا جلا جلا پا چمامہ  
اور رربڑے کے با تھر روم سپر پینے سگریوں کی ڈیبا لے کر لوٹ رہا تھا تو اس نے  
جعفری کی پوری کھلی ہوئی کھڑکی میں شریا کو کھڑے دیکھا تھا جس کے سیاہ گھنکر یا لے بال  
ماستھے اور کنپیوں پر پسینے سے چکے ہوئے تھے۔ شریانے اسے ادھر دیکھتے ہوئے پا کر انہیاں  
مسرت سے کھڑکی فوراً بند کر لی تھی۔ جب وہ جھرو کے کے عین محاذ میں آیا تو شریا کا دل  
دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے برآمدے میں ادھر ادھر چوروں کی طرح دیکھ کر  
ڈرتے ڈرتے کہا کہ اگر گیارہ گنتے گنتے وہ اس کھڑکی کے پاس آ کر السلام علیکم کہہ دے تو  
چاہے کچھ بھی ہو میں مصافحہ کے لیے ہاتھ باہر نکال دوں گی۔ جب شریانات پر پکنی تو  
وہ کھڑکی سے دو تین قدم آگے نکل چکا تھا۔ آٹھ۔۔۔ نو۔۔۔ دس اور پھر گیارہ میں اس  
نے کوئی آدھ آدھ منٹ کے وقفے دیئے۔ کچھ ایسے گنا جیسے کوئی کسی کو پکار رہا ہو مگر  
بد قسمت لڑکا برآمدہ عبور کر کے اندر کوارٹر میں داخل ہو چکا تھا۔ شریانے خدا کا لاکھ  
شکر کیا کہ اس نے صرف گیارہ ہی فرض کیے تھے۔ اگر خدا نخواستہ گیارہ سو یا گیارہ  
ہزار ہوتے تو اس کا خاندان جیتے جی مر جاتا!

ان دو تین دنوں میں سورج سوانحیزے سے ڈھلک کر ایک نیزے پر آگیا تھا  
اور بد ستور ادھر ہی ڈھلک رہا تھا۔ اسی صبح صبح ریڑھی والے سے بزری خریدتے ہوئے  
تقریباً ہر روز پوچھتیں۔ ”فضلوا آم کیوں نہیں لاتا؟“

وہ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہتا۔ ”بیگم صاحبہ اس گرمی نے تو آدمیوں کو  
پکار دیئے ہی پھوڑا پھنسی کر دیا ہے۔ میں آم لاوں بھی تو کون لے گا؟ یہ تو برسات کا  
میوہ ہے۔ ادھر کھایا ادھر ہضم۔ برکھا ہو تو دوچار ٹوکرے صاحب لوگوں کے لیے

لاؤں۔ ایسے میں ایک آدھ ٹوکرہ بھی سڑگل گیا تو میں کس کے گھر سے رقم دوں گا۔  
بیگم صاحبہ دعا کیجئے، برکھا ہو، پھر آم بہت۔“  
امی پوچھتیں۔ ”کتنے پیسے ہوئے؟“  
اور فضلو گھیا اور مینڈو کی قیمت لے کر آگے چل دیتا۔

نواب شاہ والے حیدر پچا کسی ضروری کام سے آج ہی یہاں آئے تھے اور  
کانوں کو ہاتھ لگانکا کر دیہات کی گرمی کا تذکرہ کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنی جیکٹ، ترکی  
ٹوپی سر سے اُتار کر بالوں پر ہاتھ پھیرا اور پسینے سے لھڑا ہوا پنجھ دیوار پر مار کر بولے۔  
”بھابی قسم خدا کی زمین پہلے دن کی کھیس ایسی پھٹی پڑی ہے۔ کپاس کے پودے دن بہ  
دن مر جھائے جا رہے ہیں۔ اگر ہفتہ دس دن اور بارش نہ ہوئی تو کاشنکار بر باد ہو جائیں  
گے۔ نہریں بند ہیں اور پودے چھ سات دنوں سے زیادہ نہیں نکال سکتے۔ اگر اب کے  
روئی کی فصل ماری گئی تو سارے ملک میں کال پڑ جائے گا۔ میں نے اپنارقبہ—“  
اور شریانے رسالہ سے سراخا بکران کی بات کاٹ دی۔ ”اوہ اگر بارش ہو جائے

تب بچا؟“

”پھر؟“ پچا کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔ ”پھر تو گھر گھر سونے کے  
ڈھیر لگ جائیں شریائی۔ اس وقت بارش کی ایک ایک بوند سونے کی مہر ہے۔ اصلی روے  
کا سونا ہے۔ خدا کی قسم زندگی بن جائے۔ پیغمبروں نبیوں نے ایسے ہی بارش کو باران  
رحمت تو نہیں کہہ دیا۔ ایک ایک قطرہ خدا کے دربار سے خوشیوں اور مرادوں کے  
پروانے لے کر اترتا ہے۔ بگزے ہونے کام بنتے ہیں۔ رُکے ہوئے چل پڑتے ہیں۔  
شریائی ہر کام پہلے خدا اور پھر بارش کی مہربانی سے ہوتا ہے۔“

اس کے بعد چاہی سے اپنے سرال کی باتیں کرنے لگے جن کی بڑائی کا پول  
روز بروز کھل رہا تھا۔

شریا پھر سالہ پڑھنے لگی۔

بھائی کے سکول کا ناپسٹ جسے انہوں نے بڑی مشکل سے سکول میں نوکر  
کر دیا تھا، پہلے ہفتہ میں دو تین بار ان کے گھر آتا تھا اور کچھ ادھر ادھر کے کام کر دیتا تھا  
مگر اب دس دن تک اس کی مشکل ہی دکھائی نہ دیتی تھی۔ سکول میں تو بھائی جان اس

سے کہتے ہی رہتے ہوں گے مگر جب گھر بھی آتا تو بھی اس کا پیچھانہ چھوڑتے۔ ”یار خیا میرا تھیس کب ناپ کرو گے؟ جلد کرو گے تو تمہارا ہی بھلا ہو گا۔ کانج میں لگتے ہی تمہیں بھی وہیں بلوالوں گا۔“

خیا کھیانا ہو کر کہتا۔ ”ماں صاب گرمی بہت ہے، کام پر بیٹھا نہیں جاتا۔ جس دن بارش ہوئی آپ کا تھیس آپ سے آپ ناپ ہو جائے گا۔“

”وہ کیسے؟“ شریا پوچھتی تو خیا ہمیلی پر انگلیاں رکھتے ہوئے کہتا۔

”سردیوں میں انگلیاں ٹھہر جاتی ہیں۔ گرمیوں میں پینے کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں مگر بر سات میں بس ناپ سامنے رکھ کر بیٹھ جائیے۔ بوندیاں آپ سے آپ ناپ کرتی جائیں گی۔“ شریا سے بات کرتے ہوئے ناپست بھی شاعری کرنے لگتا تھا۔

فیل پاپ کمر دھرے اور ٹانگیں صوفے پر ڈالے شریا سونے کی کوشش میں مصروف تھی اور مانی دیوار کے ساتھ پیٹھ رکھ رہا تھا۔ اس کی پلکوں پر آنسو دیکھ کر شریا نے نیم باز آنکھیں ذرا کھول کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے مانی؟“

”کھلی باجی!“ اس نے مننا کر جواب دیا۔

اور باجی نے کھنکار کر کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔“

باجی کو ایسے ملقت پا کر مانی نے پوچھا۔ ”بارش کب آئے گی باجی؟“

”جب ہم نہ ہوں گے تب۔“ آنکھیں میچ کر باجی نے انہیں بازو سے ڈھانپ لیا۔

شام کو بس سگریٹ خریدنے اور ایک ذرا سی چہل قدمی کرنے کے علاوہ وہ لڑکا لمحہ بھر کو برا آمدے سے باہر نہ نکلتا۔ شریا کو اس کے گھر یا پن پر سخت اعتراض تھا مگر جس دن مولوی صاحب کو اڑاؤں کے تمام باشندوں کو نماز استقامت پڑھانے باہر کھیتوں میں لے گئے اور وہ لڑکا یہ فرض ادا کر کے تو لیہ سر پر ڈالے واپس لوٹا تو اس کا چہرہ چند رکی طرح سُرخ ہو رہا تھا اور اس کے پاؤں ٹھیک سے زمین نہیں پکڑتے تھے تو شریا کو مولوی صاحب پر غصہ آیا کہ ایک کے نہ جانے سے کیا ہو جاتا بھلا۔ اس نے سوچا ایسا زمل اور شاستہ لڑکا اس کڑکتی دھوپ میں لائیں میں آخر کیسے نکل سکتا ہے۔ اچھا ہی

کرتا ہے جو حجت تلے رہتا ہے۔ جعفری کے پچھے سے شریانے آسمان کو دیکھنا چاہا کہ شاید بادلوں کا کوئی نکڑا۔ مگر اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

اس ونگ میں رہنے والے سب پنج شام کو شریانی باتی والی لین میں سرکندے کی وکٹیں گاڑ کر کرٹ کھیلا کرتے تھے۔ ایک تو یہ لین کافی چوڑی تھی، دوسرے ٹیم کے کمپین کا یہ خیال تھا کہ یہاں کی پنج بہت اچھی تھی۔ اکثر وہ لڑکا بھی اس کے ساتھ شامل ہو جاتا مگر دو انگ کے بعد اسے ایک باری ملتی تھی اور بادل نگ کی اجازت نہ تھی۔ شریاہر روز جعفری سے لگ کر ٹیٹیٹی میچ دیکھا کرتی مگر اس لڑکے کی حرکات سے کبھی یہ ظاہر نہ ہوا کہ اسے جعفری کے پچھے کسی کی موجودگی کا پورا پورا احساس ہے۔

ایک ایسی ہی امسی ہوئی شام کو جب پد ایمپائر اچھے باولوں کی پھینکوں پر نوبال دے رہا تھا تو تمام کھلاڑیوں نے ہوا میں انگلیاں اٹھا کر ”ہاؤزیٹ! ہاؤزیٹ“ کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ پدا کہہ رہا تھا کہ میں کیا کروں پنج خراب ہے اور گڑھوں سے بال اچھلتا ہے تو میں نوبال دینے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ ٹیم نے اس کی ایک نہ مانی اور بھائی جان کو ایمپائر بناؤ کے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ شریاہنے لگی اور اس لڑکے نے ہوا میں خلیل جبران کی سی انگلی اٹھا کر کہا۔ ”دیکھو آج ایمپائر نہیں بدلتا بلکہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ پنج ٹھیک نہ ہو جائے، ٹوپیاں لگے، نیکریں کے اور شلواریں اڑ سے پچھے پھر نعرے لگانے لگے۔“ پنج ٹھیک کرو، پنج ٹھیک کرو۔“ شریاہنی کا دورہ ساپر گیا۔ اس نے پھر ہوا میں ہاتھ بلند کیا اور کہا۔ ”ان دونوں پنج ٹھیک نہیں ہو سکتی۔ جب بارش ہوگی تو ہم سب گھر پوں اور کدوں سے زمین ہموار کریں گے۔ میلی مٹی کوٹ کوٹ کے بھائیں گے اور مینگ بچھا کے کھیلا کریں گے۔“

پتے نے کہا۔ ”پھر ہم اعلیٰ وکٹیں بھی لے آئیں گے۔“

اس نے ایمپائر کا سر تھپٹھپا کر کہا۔ ”ضرور!“

مانی نے جھمکتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ چلے تو نہیں جائیں گے؟“

”ہرگز نہیں۔“ اس نے مانی کو اٹھا کر کندھے پر بٹھالیا۔ ”میں جانے کے لیے

تھیوڑی آیا ہوں۔“

شریانے شرما کر دو پے کا پلو انگلی پر لپیٹنا شروع کر دیا۔ اسے یوں لگا جیسے توازن

قامہ رکھ سکنے کی وجہ سے اس نے غیر ارادی طور پر کسی کے سر کے بال دونوں چڑگلوں میں جکڑ لیے ہوں۔

کھیل پھر شروع ہو گیا۔ اب وہ آف بریک پر کچ کپڑنے کے لیے جعفری کی کھڑکی کے عین پاس کھڑا تھا۔ ثریا نے پیچھے سے دیکھا، اس کی ایک قلم دوسرا سے قدرے بڑی تھی اور گردن پر داٹیں جانب ایک چھوٹا سا سیاہ تل تھا، ملکل کا گرتہ اس کی ساری کمر پر پسینہ سے چپکا ہوا تھا اور جسم کی مسلسل حرکات سے اس پر بے شمار چوکور خانے ابھر آئے تھے۔ جب وہ گیند کپڑنے کو آگے بڑھتا تو ملک کے اس ریکٹ کے بہت سے خانے مت جاتے اور کئی نئے ابھر آتے۔ جانے کس نے ہٹ لگائی اور وہ آگے جھک کر گیند بونچنے لگا اور محور پر تیزی سے گھومتا ہوا گیند اس کی ٹھوڑی کوریتی چٹا کر آگے نکل گیا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار ٹھوڑی سہلانے لگا تو جھرو کے سے ایک قہقهہ بلند ہوا۔ اس نے پیچھے گھوم کر دیکھا اور پیشتر اس کے کہ ثریا کھڑکی بند کرتی، اس نے سر ہلا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا۔ ”خدا کی قسم تم ہنس رہی ہو۔ میری جلد کو چیونیاں نو پختے لگی ہیں۔“ ”ثریا مسکراتی تو وہ آگے سرک آیا۔ کھڑکی بند ہو گئی اور لڑکی دُور ہو گئی۔

باوجود اس کے کہ دوپھر کو ثریا ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکی تھی، اس پر بھی اسے ساری رات نیندہ آئی۔ خدا خواستہ اس واقعہ کی وجہ سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ کب صبح ہو اور کب وہ امینہ کو جا کر سارا واقعہ سنائے۔

اگلے دن امینہ کے چھوٹے سے کمرے میں ابھی وہ ٹیبل فین چلا کر بیٹھی ہی تھی اور ابھی اس کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ کھٹاک سے کمرے کا پشت بھڑا۔ ٹھنڈی ہوا کا وہ جھونکا جس میں تازہ تازہ بھوسے کی خوشبو کے علاوہ سچ مج تکے بھی ہوتے ہیں، اندر رکھس آیا۔ دونوں پر ایک کیپی کی طاری ہو گئی۔ باہر سے مالی چلایا۔ ”بادل۔“ برا آمدے سے ڈیڈی کی آواز آئی۔ ”بارش۔“ پھر روشندانوں کے چھبھو پر پاٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ امینہ نے اسے لاکھ روکا، متین کیس، کار میں چھوڑ آنے کا وعدہ کیا مگر وہ بر قعہ پیشی بس شینڈ کی طرف بھاگ گئی۔

موسلا دھاری نہ برس رہا تھا اور ڈرائیور کافی تیز بس چلا رہا تھا۔ اس پر بھی اس

کے ہونٹ آپ سے آپ کہہ رہے تھے۔ تیز چلاو اور تیز چلاو۔ ہر شینڈ پر جیاں بس ایک آدھ منٹ کے لیے رکتی، وہ جلدی جلدی کہتے ہوئے دونوں ہاتھ ہلانے لگتی جیسے عمر بھر کی محنت کا نمہ اس کی آبی تصویریوں کا مجموعہ کوٹھے پر کھلارہ گیا ہو۔

جب وہ گھر کے بس شینڈ پر اتری تو اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اپنی لین میں داخل ہونے سے پیشتر اس نے نقاب کے دونوں کنارے مضبوطی سے مٹھیوں میں بھینچ لیے۔ تندو تیز جھپا کوں میں جب نقاب کی بھیگی ہوئی جالی سے اس نے آگے دیکھا تو لطیف صاحب کے کوارٹر پر ایک تانگہ کھڑا تھا۔ تانگہ والا سیاہ ٹرنک آگے پھنسا رہا تھا اور سواری ہاتھ میں ایک لمبی سی ولا یتی بنسی تھامے کھڑی تھی۔ جب اس نے اپنے برآمدے کی پہلی سیرھی پر قدم رکھا تو چھن چھن بھیگے ہوئے گھنگھرو بجا تا گھوڑا آگے کو چل دیا۔ شریانے پیچھے مرکر دیکھا ہی نہیں بلکہ اپنے نقاب کے کنارے بھی چھوڑ دیئے۔



## ایل ویرا

ایک گز! دو گز— تین گز!

جہاز نیپلز کے گھماٹ سے آہستہ آہستہ دور ہو رہا تھا اور مسافر رینگ کے پاس بے تابی سے رومال بہار ہے تھے۔ گینگ وے اٹھنے سے ذرا پہلے بارش شروع ہو گئی تھی اور اب جب جہاز دھیرے دھیرے اپنا رخ بدل رہا تھا، پھوار عرشہ کی طرف لپکنے لگی تھی اور لوگ جنگل سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ گھماٹ پر الوداع کہنے والوں میں سے چند ایک نے اپنے اور کوٹالٹ لیے اور باقی برآمدے میں چلے گئے۔ اُلٹے ہوئے کوٹوں کے موئی استروں پر بارش کی بوندیں ایک دوسری کے پیچھے تیزی سے پھیلیں۔ نمی سے بوجھل رومال عقیق کے ٹوٹے پتے کی طرح دائیں بائیں بے معنی سی تو سیں کامنے لگے اور جہاز اور دُور ہو گیا۔ یونچے گھماٹ کے ٹکنیں پشتے اور جہاز کی دیوار کے درمیان ساکن پانی چھپاک چھپاک بولنے لگا۔ میرے قریب ہی آنسو بھاتی ایک دھان پانی سی لڑکی نے بڑے زور سے Adiocaroladio کہا مگر پانی کا ایک بڑا سا چھپاکا اس کی آواز نکل گیا۔ بارش کی بوندیوں کے پیچھے بند رگاہ کی روشنیاں آنسو بن کر گلٹی جا رہی تھیں اور ان کی کرنوں کوینہ کے اندر ھے شیشے نے کاث کاث کے دھنلا دیا تھا۔

میں نے اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کچھ مسافر رو رہے تھے۔ کچھ انہیں تسلیاں دے رہے تھے اور باقی خاموشی کے ساتھ انہیں تکتے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے کوٹ کی بھیگی ہوئی آسمیں کو دیکھا۔ اس میں سے فینائل، فلاٹین اور پڑوں کی بو آرہی تھی۔ معان مجھے خیال آیا کہیں میری آنکھوں میں خوشی کے آنسو تو نہیں اُمَّہ آئے؟ میں نے پوٹوں سے پوٹوں کو چھواتا تو آنکھیں بدستور چھالیا کی

طرح خشک اور سخت تھیں۔

ڈیڑھ برس روما میں بڑے سکون سے گزرا تھا۔ نہ فکر فردا، نہ غم دوش! دفتر سے تنخواہ مل جاتی تھی۔ گھر سے خیریت کا خط آ جاتا تھا۔ دوست سینما یا تھیٹر کی دعوت بھیج دیتے تھے اور میں کار پوریشن S.P.Q.R کا سر بھر دودھ پی کر آرام سے سو جاتا تھا کہ ایک دن امریکہ سے ایک پاکستانی طالب علم وطن لوٹتے ہوئے چند دن میرے مہمان ٹھہرے۔ میں نے استطاعت سے بڑھ کر ان کی خاطر مدارت کی۔ اچھے ریستوران میں کھانا کھایا۔ اچھے کلب میں شب بسری کا بندوبست کیا۔ فر سکاتی لے جا کر دینو پلاں۔ یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ملایا۔ ریڈ یوروم کے فنکاروں سے تعارف کرایا۔ آخری رات روم کی مخصوص گلیوں میں ان کے تقاضوں کی ترجیمانی کی۔ بھاؤ پوچھئے، رعایت کی درخواستیں گزاریں۔ بد قسمتی سے سودا طے نہ ہو سکا اور بخارہ گھانا توٹا کھا کے وطن واپس گیا تو اس نے راولپنڈی جا کر میرے ایک دوست کے کان یوں بھرئے کہ میاں صاحبزادے جیسے کورے یہاں سے گئے تھے، ویسے ہی کورے بیٹھے ہیں، نہ سکھانہ سکھایا نہ پڑھے نہ گئے!

سردیوں کی ایک دھنڈی شام کا ذکر ہے کہ مجھے راولپنڈی سے ایک تھدید آمیز خط ملا۔ الفاظ کا کوئی ایسا تیرنہ تھا جسے طعن و تشیع کے پیکاں سے سجا یا نہ کسی نفیاتی میں میری کم ہمتی، بزدلی اور کوتاہ آستینی کارونا رویا گیا تھا اور ہر تان کی نہ کسی فسیاتی مسئلے پر ثبوتی تھی۔ مضمون میں کہیں باڑن کی شاعری تھی۔ کہیں گو گیں کے رنگوں کی آمیزش تھی۔ ادھر ادھر بودلیر کی کالی جشنیں آنکھ مار رہی تھیں۔ مضمون کے مجنون نے مجھے سنکھیے کا کشتہ سا بنا دیا۔ میں نے ریڈ یو شیشن سے نکلتے ہی ٹھا کر کوکندھے سے پکڑ لیا اور ہاتھ ہوا میں لہرا کے کہا۔ ”چلو دیا تو سکانا چلتے ہو؟“

ٹھا کرنے بھر پور بنگا ہوں سے میری طرف دیکھا اور پھر نظریں زمین پر گاڑی دیں۔ ایک مرتبہ پھر سر اٹھایا۔ میرے دل پر ہاتھ رکھا اور پوچھا۔ ”چ؟“ میں نے چاپی جیب سے نکال کر جواب دیا۔ ”یعنی پڑوں سے لباب بھری ہے۔ سڑکیں دھلی دھلانی رکھی ہیں اور ہمیں کوئی کام نہیں۔ تم ساتھ دو تو۔“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”ارے مورکھ میرا تو جنم مرن کا ساتھ ہے تو

نگی بنے جب نا دیو سو گند تو چلے تو کلا جگ جائے۔“  
میں نے معاملہ کی اہمیت کم کرتے ہوئے کہا۔ ”ٹھاکر میں تو آتا جاتا ہی رہتا  
ہوں۔ کہے تو آج تیرا شپا بھی لڑادوں۔“  
ٹھاکر کے تن مردہ میں جان آگئی۔ اس نے عین اطالویوں کی طرح کندھے  
سکوڑ کر کہا۔ ”نجانے کیوں میرا توہر دے کاپنے لگے ہے۔“

مجھے خط کا مضمون یاد تھا۔ ٹھاکر کے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا۔  
”برخوردار یہ ہر دے وردے کچھ چیز نہیں، یہ سب مدر فگر ہے مدر فگر اور یہ سایکالو جی  
کی ایک چیز ہوتی ہے۔ مگر تم اسے نہیں سمجھو گے۔ چلو جلدی کرو۔“  
اس کے بعد میں اور ٹھاکر ایک دوسرے کے پروں پر اپنا آپ توں کر موڑ  
میں بیٹھ گئے۔

مینہ کے پانی سے سڑکیں دھل کر خشک ہو چکی تھیں اور ان پر نی آت کے گھے  
ہوئے ٹاروں کی آواز نئے پہیوں کی صدا بن کر گونج رہی تھی۔ ہوا کے تیز  
جھونکوں سے درختوں کی شاخیں بارش برساتیں تو ہماری موڑ کی آواز اور امیرانہ ہو جاتی۔  
دیبا تو سکانا پہنچتے پہنچتے بتی جلانے کا وقت آگیا اور جب ہم نے درختوں کے درمیان گھری  
ہوئی سنان سڑک پر موڑ رکی تو ایک بھاری بھر کم عورت اس کے سامنے آ کر کھڑی  
ہو گئی۔ اس نے بونٹ پر انگلی بجا کر بڑے ہی پیارے انداز میں کہا۔ ”صد قے ذرا تیز بتی  
روشن کرنا۔“

میں نے بڑی ہمت سے کہا۔ ”بس اس سے زیادہ تیز نہیں ہو سکتی۔“ اس نے  
مٹھی کھول کر لیرے گنتے ہوئے کہا۔ ”چلو جانے دو، یہی کافی ہے۔“ میں نے پیچھے مڑ کر  
ٹھاکر سے پوچھا۔ ”اے بلاوں؟“ ٹھاکر سہم کر جلدی سے بولا۔ ”جانے دو جی یہ تو بہت  
موٹی ہے آگے چلو!“ وہ پیسے گن کر ہماری طرف بڑھی تو ہم نے کار آگے سرکالی اور اس  
سے کوئی سو گز کے فاصلہ پر جا کھڑے ہوئے۔ درخت کی اوٹ سے ایک پستہ قد مگر  
نوجوان عورت آگے بڑھی اور اس نے کھڑکی سے دونوں بازو کہنیوں تک اندر بڑھا کر  
پوچھا۔ ”اکلیے ہو؟“

”نہیں دو۔“ ٹھاکر جی گھبراہٹ میں بول اٹھے۔

”زراٹھرو۔“ اس نے بازو باہر نکالتے ہوئے کہا اور پیچھے مڑ گئی۔

میں نے پوچھا۔ ”یہ ٹھیک ہے ٹھاکر جی؟“

تو ٹھاکر نے ایک لمبی سی ہوں کے ساتھ کہا۔ ”بھلی ہے جی۔“

اسی اثناء میں وہی بھلی اخبارہ بیس سال کی ایک لمبی سی لڑکی کو ساتھ لے کر

آگئی۔ میں نے کار کا دروازہ کھولا تو ٹھاکر جی نے آہستہ سے کہا۔ ”جباب کتاب پوچھ لو جی۔ یہ پر دیسیوں کی جامست بنادیتی ہیں۔“

لہی لڑکی نے ہماری بولی من کر ہو لے سے کہا۔ ”پر دیسی معلوم ہوتے ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں میرا دوست پر دیسی ہے اور میں اس سے اس کی ملکی زبان

سیکھ رہا ہوں۔“ اس پر اس نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کھنکار کر کہا۔ ”ہاں جی تو فرمائیے؟“

وہ بھلی نہس پڑی اور اپنی انگوٹھی سے موڑ کی چھت نکل کر بولی۔ ”ہم کیا فرمائیں، آپ ہی بتائیے۔“ دو ہزار لیرے ہوں گے۔

”چودہ روپے!“ ٹھاکر نے جلدی سے حساب لگایا۔

”دس۔“ میں نے غلطی نکالی۔

”دس تھہارے دلیش کے، ہمارے تو چودہ ہی ہوئے تھا۔“

میں نے ٹھاکر کی بات کا جواب دیئے بغیر بڑے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”جلدی کرو۔“ اور انہجن شارٹ کر لیا۔

بھلی نے کہا۔ ”تو پھر متظور ہے؟“

میں نے کہا۔ ”منظور و ظبور کچھ نہیں، دیکھا جائے گا۔“

اس پر دلبی پتی دوسری لڑکی نے تک کر کہا۔ ”ہم مستقبل کے قائل نہیں،

پہلے بات طے ہونی چاہیے۔“

بھلی واقعی بڑی بھلی لڑکی تھی۔ اس نے آشی بھرے لجھ میں کہا۔ ”بھگڑا

کس بات کا، بعد میں کہی مگر زرا جلدی کرو۔ ان دنوں پولیس ادھر دوش مار رہی ہے۔“

ٹھاکر جی اور بھلی لڑکی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے اور میرے کھاتے میں انہوں

نے وہ بد تیز اور بد دماغ لڑکی ڈال دی۔ میں موڑ چلا رہا تھا اور پینے کے باعث سٹریگ

میرے ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ جاتا تھا۔ باری باری میں دونوں ہاتھ اپنی ران پر رکڑ کر خٹک کرتا۔ سگریٹ پر سگریٹ سلاگاتا، اسپھول کے چلکے اور بہی دانہ کا جو مغلوبہ میرے حلق میں ابھرتا، اسے بار بار لگتا۔ میرے باپ دادا کی بڑی بڑی سفید پیڑیاں میرے پیر چچا کی دستار مبارک، ہمارے مزاروں کی اٹھتی ہوئی انگلیاں اور ہمارے طاز موس کی دبی دبی ہنسی ایک ساتھ موڑ کے پہلو میں اڑی آتی تھی۔ اچانک پچھلی سیٹ پر کھٹ سے کچھ ہوا۔ ٹھاکر جی نے مدر فگر کی پونچ کی پر دون کھوتے کا وار کر دیا تھا۔ میں نے بات مالائے ہوئے اپنی لڑکی سے پوچھا۔ ”ابھی کتنی دور اور چلتا ہے؟“ اس نے آہستہ سے کھنکار کر کہا۔ ”ابھی آبادی ختم ہوتی ہے ابھی کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔“ میں نے پھر سڑک پر نیگاہیں جمالیں۔ ٹھاکر جی نے میری نشست کی پشت پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”بڑی بد تجھ ہے جی یہ لڑکی۔“

میں نے کہا۔ ”پر دلیں میں یو نہی ہوتا ہے ٹھاکر جی۔ دھیرج سے کام لو۔“

در اصل میں اپنا دھیرج بندھا رہا تھا۔

میری سہیلی نے کہا۔ ”روکو۔“ اور ہم نے کار سڑک کے کنارے کھڑی کر لی۔ وہاں کھیتوں کے کنارے پہلے ہی چند کاریں، موڑ سائیکل اور سکوٹر کھڑے تھے۔ جب ہم اترے تو دونوں لڑکیاں ہماری قیادت کرنے لگیں۔ چند قدم چلنے کے بعد بھلی نے کہا۔ ”بس یہی جگہ ٹھیک ہے۔ یہ درخت ہمارا، وہ تمہارا۔“

میں نے ایک نظر اپنے درخت کو دیکھا۔ کچھ اسی قسم کے نیم کے ایک پیڑتے میری نانی محلہ کی لڑکیوں کو قرآن اور احوال الآخرت پڑھایا کرتی تھیں۔ لڑکیاں چادروں کی بلکلیں مارے، ماتھے تک اوڑھیاں کھینچنے تلاوت کیا کرتیں۔ ہم آستینیں چڑھائے اور نیکریں پہننے ان کے قریب سے گزرتے تو وہ ساری کی ساری رحل اپنے آنچل میں چھپالیا کرتیں۔ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ ”نہیں، یہ جگہ ٹھیک نہیں۔“ ٹھاکر جی میرا سہارا پا کر بولے۔ ”تم یورپی لوگوں کو شرم بھی نہیں آتی۔“ اس پر میری لڑکی نے پلٹ کر جواب دیا۔ ”تم کو بڑا حجاب ہے نا، جبھی موڑوں میں گھومتے پھرتے ہو۔“

میں نے چلا کر کہا۔ ”بکواس بند کرو۔“

بھلی خوش ہو کر بولی۔ ”عملی بات ہوئی نا۔“

میں نے کہا۔ ”کچھ عملی و ملی نہیں، ہم یہاں ایک لمحہ رکنے کو بھی تیار نہیں۔  
ہم آگے چلیں گے۔“

”ہم آگے نہیں جائیں گے۔“ میری لڑکی نے سراٹھا کر جواب دیا۔

”ضرور جائیں گے۔“ میری جھلاہٹ غصے میں تبدیل ہو گئی۔

ٹھاکرنے ہولے سے کہا۔ ”جھگڑتے کیوں ہو جی، جانے دو۔ ویشیا کا یہی کام

ہے۔“

”موڑ میں چل کے فیصلہ کرتے ہیں۔“ بھلی نے موقع کی نزاکت کا احساس کیا اور ہم موڑ کی جانب چل دیئے۔

جب میں نے گاڑی شارٹ کی اور آگے کی طرف چلنے لگا تو میری سہیلی نے باہمی ہاتھ سے سینیز روما کی طرف کاٹنا شروع کر دیا۔ میں دوسری طرف گھماتا تھا اور وہ اپنے رُخ پھرائے جاتی تھی۔ موڑ ایک کنارے سے دوسرے کنارے بدست شرمنی کی چال چلنے لگی۔ مجھ سے ضبط نہ ہوا کہ اور میں نے ایک ضدی آگ بھسکو کا بیچے کی طرح اس کی کلائی پر زور سے تھپٹہ مارا۔ اس کی طلاقی پیچی کی زنجیر میں قدیم روم شہنشاہوں کا لکھتا ہوا سکھ جھوول کر میری ایک پور پر لگا اور اس کا ہاتھ آپ سے آپ پھسل کر اس کی گود میں جا گرا۔ اس نے مُڑ کر میری طرف عجیب و غریب نظروں سے دیکھا۔ پھر کہنے لگی۔ ”سینور ہم آگے نہیں جائیں گے۔“

”کیوں آخر؟“ میں نے کہا۔ جیسے میرا مطلب ہو۔ ”ہمارے حرم کو یہ جرأۃ کیونکر ہوئی۔“

”بس ہم نہیں جائیں گے۔“ بھلی نے وجہ بیان کی۔

”مگر کیوں؟“ ٹھاکر جی نے دلبی زبان سے پوچھا۔

”اس لیے کہ روما کی حد یہیں ختم ہو جاتی ہے۔“ میری لڑکی نے کہا۔ اور آگے ”دوئے پونتی“ نیا علاقہ شروع ہو جاتا ہے۔“

”اس کا مطلب؟“ میں نے اطمینان سے پوچھا۔

”یہی کہ ہم روما کی حد عبور کرنا مناسب نہیں سمجھتیں۔“

”کیوں؟“ میں نے ماتھے پر سلوٹ ڈالے۔

”بس اسی لیے کہ ہم مناسب نہیں سمجھتیں۔“ بھلی نے ایک اور وجہ بیان کی۔

میں نے کہا۔ ”مگر ہم تو مناسب سمجھتے ہیں اور ہم دوئے پونتی جا کر ہی دم لیں گے۔“

بھلی نے چمک کر کہا۔ ”تمہیں اس کا خمیازہ بھگلتنا پڑے گا۔ ہم دوئے پونتی کے تھانے میں تمہارے خلاف رپٹ دے دیں گی۔“

میں نے جوش میں آکر کہا۔ ”تم چاہے صدر جمہور یہ کو رپٹ دے دو۔ کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔“

بھلی نے کہا۔ ”ہم شور چاہیں گی۔ چور، بد معاشر، ڈاکو کہہ کر پکاریں گی اور تمہیں بستی کے لوگوں کے حوالے کر دیں گی۔“

ٹھاکر نے کہا۔ ”واپس چلو جو ویشیا کیا اعتبار!“

میں نے خوفزدہ ہو کر چلا بکے کہا۔ ”دیکھا جائے گا۔“ اور موڑ اور تیز کر دی۔ بھلی لڑکی نے زور کی چینچماری اور میرا اور ٹھاکر کا کلیجہ دھل گیا۔ میں نے موڑ روک لی۔ دروازہ کھولا اور باہر نکل آیا۔ شدید خوف اور اس کے رد عمل، ڈر اور جھلاہٹ سے میں تھرھر کانپ رہا تھا۔ دوسرا دروازہ کھول کر میں نے اپنی ساتھی کو بازو سے پکڑ کر باہر کھینچا، پھر ٹھاکر کی بھلی لڑکی کو گھسیٹ کر سڑک پر گرا کیا۔ دروازہ بند کیا اور موڑ گھما کر روما کی طرف رخ کر لیا۔ بھلی کی قفس گالیاں بڑی شدت سے ہمارا تعاقب کر رہی تھیں اور ٹھاکر اپنی سیٹ پر پتے کی طرح کانپتا ہوا کہہ رہا تھا۔ ”حرام جادیاں ساری رات چلتی رہیں تو بھی رومانہ پینچ پائیں گی۔“ میں نے مز کر دیکھا۔ بھلی پر ہمیشہ یا کی کیفیت طاری تھی اور لمبی لڑکی خاموشی سے اسے سہارا دیئے چل آ رہی تھی۔ ٹھاکر نے کہا۔ ”تم نے بھلا ہی کیا جی، نہیں تو سر کو آ جاتیں۔“

میں نے موڑ روک کر بیک کرنی شروع کی اور عین ان کے قریب پینچ کر روک لی۔ باہر نکل کر میں نے دیکھا کہ لمبی لڑکی کی کراس قدر تنگ تھی کہ وہ زردر گنگ کے لبے کوٹ میں بھڑسی دکھانی دیتی تھی۔ اس کے ساتھ بھلی اور بھی پستہ قد ہو گئی تھی۔ مجھے ایک مرتبہ اپنے سامنے پھر اس طرح کھڑے دیکھ کرو وہ مجھ پر چھٹی مگر بھڑنے

اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر زور سے اپنی طرف کھینچ لیا۔ موڑ کا دروازہ کھول کر میں نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”تشریف رکھیے۔“

جب ہمارا کارروائی پھر روانہ ہوا تو میں نے اطمینان سے کہا۔ ”یہ نہ سمجھئے گا کہ میں نے آپ سے ذر کو موڑ بیک کی ہے۔ آپ کا پروگرام اب بھی رپٹ کرانے کا ہو تو کار کا نمبر نوٹ کر لیجئے۔ میرا شناختی کار ڈیکھ لیجئے۔ میں دلش گاہ رووم کے شعبۂ شرقيات میں اردو پڑھاتا ہوں اور اطالوی نہیں ہوں۔ مجھے کسی کا ذر نہیں۔ آپ کے جی میں جو آئے سو کیجئے۔“ بھلی اب بھی ہولے ہولے گالیاں دے رہی تھی اور ٹھاکر بڑے پیار سے اس کا کندھا تھپٹھپا رہا تھا۔ میں نے ایک نظر زیور کو دیکھا وہ خاموشی سے دونوں ہاتھ گود میں ڈالے شیشے سے باہر چاندنی کا نظارہ کر رہی تھی۔

ویسا تو سکانا پہنچنے سے پہلے میری ساتھی نے کہا۔ ”بس یہیں روک لیجئے، ہم یہیں اتریں گے۔“

گاڑی رکی۔ اس نے دروازہ کھول کر ابھی ایک پاؤں ہی زمین پر رکھا تھا کہ میں نے اس کی کلائی تھام کر پوچھا۔ ”زیادہ چوت تو نہیں آئی؟“ میں بھی عجیبِ حق تھا، بچوں کی طرح تھپٹھپڑ چلانے لگا۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ”چوت کیسی، مجھے تو یاد بھی نہیں رہا۔“

دوہزار لیرے نکال کر میں نے اس کے ہاتھ میں دیئے تو وہ ذرا جھکی پھر انہیں پرس میں ڈال کر موڑ سے باہر نکل گئی۔ سیٹ کی پشت پر جھک کر میں نے بھلی کو دوہزار لیرے دیتے ہوئے کہا۔ ”امید ہے اب آپ ہم سے ناراض نہیں ہوں گی۔“

اس نے نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر بڑی مشکل سے ”نہیں“ کہا اور لیرے گویا میرے ہاتھ سے چھین کر دروازہ کھول کر ایک دم نجانے کہاں غائب ہو گئی۔

ٹھاکر نے شکوہ آمیز لمحے میں کہا۔ ”تم نے یہ کیا کیا تھی؟“

میں نے کہا۔ ”تم چپ رہو، تم مدر فلگر کے مارے ہوئے ہو۔“ اور کارشارٹ کر لی۔

یو ٹیورٹی کا سالانہ ڈنر تھا۔ باوسانی، فیراکوتی، وی پتیر دادر میں ایک کونے میں